اداریہ

اُردو کی ترویج و ترقی سے زیادہ یہ زبان موجودہ دور میں تحفظ کے لیے ہاتھ پیر مار رہی ہے۔ اُردو کا ہر کوئی طالب علم، استاد، ادیب، شیدائی اس بات سے بخوبی واقف ہے اور ہر اپنے فہم و ادراک کے مطابق اس کی زبوں حالی پر نوحہ کناں ہے۔ اُردو کی جائے پیدائش اور اس کے مقامِ افزائش کے تعلق سے اب احباب قسمیں تک کھانے لگے ہیں کہ یہ ہندستان کی ہی زبان ہے مگر سُننے والا کون ہے۔ فی زمانہ قومی سطح پر ہندستان میں جو سیاسی نظام رائج ہے اُس نے اُردو بولنے اور لکھنے والوں کو اور بھی عدم تحفظ کے احساس سے دوچار کیا ہے۔ اُردو زبان کو اس وقت ہندستان میں جتنے بھی مسائل درپیش ہیں وہ ایک بڑے مسئلے کی کڑی کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔ یوں تو ۱۹۴۷ء سے لے کر تا حال حکومتِ ہند اور کئی دوسرے صوبہ جات نے اُردو کی ترقی اور ترویج کے لیے مختلف اور متعدد منصوبے مرتب کیے، جو اکثر و بیشتر انتخابی منشوروں کی زینت بنا کرتے ہیں لیکن زمینی سطح پر وہ منصوبے ہمیشہ تشنۂ تکمیل ہی رہا کرتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اُردو زبان کی ترقی انتخابی سیاست سے مشروط ہو کر رہ گئی ہے۔ اس ضمن میں اُردو کا ایک دل چسپ اور درد انگیز پہلو بھی توجہ طلب ہے۔ اُردو کی بقا اور ترویج کے لیے مرکزی اور صوبائی انتظامیہ کے تحت جو ادارے معرضِ وجود میں لائے گئے ہیں اُن کے ذمّہ داران اور اُن میں برسرِ روزگار لوگ ہی اُردو کی تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے لیے پیش پیش دیکھے جا رہے ہیں۔ یہاں پر کسی خاص شخص یا ادارے کی تذلیل و توہین مقصد نہیں بلکہ اپنے قارئین کو وہ آئینہ دکھانا چاہتا ہوں جس میں وہ اُردو زبان کی مخدوش صورت حال کے لیے ذمّہ دار عناصر، افراد اور اداروں کا عکس دیکھ سکیں۔ یہ حضرات کتابوں کی اشاعت کے لیے فراہم کی جانے والی مالی امداد سے لے کر ادبا اور شعرا کو انعامات کی تفویض تک جس طرح حلقہ سازی، سانٹ گھانٹ اور گٹھ جوڑ کے مرتکب ہو رہے ہیں اُس کی مثالیں دوسروں کے یہاں ناپید ہیں۔ کچھ اداروں نے کتب کی اشاعت کے لیے فراہم کی جا رہی مالی امداد کے لیے عجیب قوانین وضع کیے ۔ وہ پست و بلند کے معیار سے بے نیاز ہو کر ہر قسم کے مسوّدے کی اشاعت کے لیے امداد فراہم کرنے میں فراخ دلی کا مظاہرہ تو کرتے ہیں لیکن اُس مسوّدے کو امداد سے محروم رکھتے ہیں جس پر قلم کار کو ڈاکٹریٹ کی سند تفویض کی گئی ہو۔

اس تعلق سے سوال قائم کیا جا سکتا ہے کہ کیا ہر اُس مسوّدے کی قسمت میں کتاب کی صورت میں منقلب ہونا ہوتا ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں بلکہ خال خال ہی کوئی مسودّہ کتاب کے سانچے میں ڈھلنے کے لیے خود کو پیش کرتا ہے جس میں قلم کار کی عرق ریزی اور ذہنی پختگی کو برراہِ راست دخل ہے۔ کتاب چھاپنے کے آرزومند حضرات وخواتین ادبی میدان کے خوب وزشت سے کماحقہ واقف ہوتے ہیں اور اسی لیے مسوّدے کو شائع کرنے کی گزراشات کرتے رہتے ہیں، جس کی جسارت سبھی سند یافتہ نہیں کرتے ہیں۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ کوئی ادارہ کس طرح سند کی تحصیل کے لیے لکھے گئے ہر طرح کے مقالے کو بیک جنبشِ قلم نظرانداز کرسکتا ہے اور جامعات سے باہر مرتب کیے گئے ہر طرح کے مسوّدے امداد کے لیے منظور کیے جاتے ہیں؟ سرکاری اداروں کی یہ بے معنی منطق کم سے کم ہماری سمجھ میں تو نہیں آ رہی ہے۔ سند کے لیے لکھا جانے والا ہر کوئی مقالہ معمولی نہیں ہوتا ہے بلکہ کچھ مقالے یقیناً غیر معمولی ہوتے ہیں۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ کچھ ادبا ورناقدین کے تحقیقی مقالے اتنے اہم ثابت ہوئے کہ وہ ادبی دنیا میں اُن کی شہرت وانفرادیت کے ضامن بن گئے۔ اس حوالے کئی مثالیں ہمارے سامنے ہیں جن کے تذکرے کی یہاں پر گنجائش نہیں۔ سرکاری اداروں کی یہ ناقص منصوبہ بندیاں اور یہ بے تکے اصول وضوابط یہیں تک محدود نہیں بلکہ انعامات کی تفویض وتقسیم کا معاملہ بھی غیر تسلی بخش ہے۔ یہ ادارے انعامات کی تفویض کے لیے قلم کاروں سے کتابیں جمع کراتے ہیں اور بعد میں جتنی کتابیں موصول ہوتی ہیں اُن سب کتابوں کو ایک ہی طرح کے انعام سے نوازتے ہیں۔ یہ ادارے ماہرین کے نام پر یونیورسٹی اساتذہ کی ایک کمیٹی بھی بلاتے ہیں اور اپنے جانبدارانہ فیصلہ جات پر اُن کی مہرِ تصدیق ثبت کرانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں مگر دیکھنا یہ ہے کہ کیا اِن اداروں سے اُردوزبان کی خاطر خواہ خدمت ہورہی ہے یا کچھ بااثر افراد اپنا اپنا اُلو سیدھا کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ اس تعلق سے اُتر پردیش اُردو اکادمی کا معاملہ سرفہرست ہے۔ مذکورہ ادارے میں جتنی بھی کتابیں انعام کے لیے موصول ہوتی ہیں، سب کتابیں بلالحاظِ معیار ومقام، موضوع ومواد اور پست وبلند کے ''انعام سے سرفراز'' کی جاتی ہیں اور توصیفی سند پر یہ الفاظ کہ ''اس تصنیف کو اُردو اکادمی ادبی سرمایہ سمجھتی ہے'' جہاں صاحبِ کتاب کی پیٹھ تھپتھپاتے ہیں وہیں اُس کی غیر معیاری اور غیر سنجیدہ تحریروں کو سند عطا کی جاتی ہے اور وہ اپنی سطح پر خود کو اپنے فن کا ماہر متصور کرنے کا مستحق سمجھتا ہے۔ اس صورتِ حال میں اُردو اداروں کے ذمّہ داروں کو اپنے اصول وضوابط پر از سرِ نو غور کرنے کی شدید ضرورت ہے۔

ہندستان کی ہر جامعہ میں شعبۂ اُردو قائم نہیں ہے تاہم جہاں موجود ہے وہاں اُردو کی تعلیم و تعلم اور تحقیق و تنقید کی تمام سرگرمیوں پر وقتاً فوقتاً سوالات قائم کیے جا رہے ہیں۔ یونیورسٹی کی سطح پر لگ بھگ ہر شعبہ کا ایک سالانہ یا شش ماہی مجلّہ شائع ہوتا ہے جو اُس شعبہ کی تحقیق و تنقید کے ضمن میں ہوئی رہی پیش رفت کا عکاس ہوتا ہے نیز اساتذہ کی نکتہ رسی اور دانش و بینش کا آئینہ ہوتا ہے۔ طلبا و طالبات اِن مجلّوں میں شامل مقالوں سے استفادہ کرتے ہیں اور اِن سے اپنی علمی اور ادبی میلانات اور رجحانات کی سمت نمائی کا کام بھی لیتے ہیں۔ لیکن جب ہندستان کی جامعات میں قائم اُردو کے مختلف شعبہ جات پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں تو انگلیوں پر گنے جانے والے چند ایک مجلّات مثلاً ''تہذیب و ثقافت'' (اُردو تہذیب و ثقافت مرکز، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد)، ''تسلسل'' (شعبہ اُردو، جموں یونیورسٹی، جموں)، ''بازیافت'' (شعبہ اُردو، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر)، ''ترسیل'' (اُردو ڈیوژن، نظامت فاصلاتی تعلیم، کشمیر یونیورسٹی، سرینگر)، ''اقبالیات'' (ادارۂ اقبالیات برائے ثقافت و فلسفہ، کشمیر یونیورسٹی، سرینگر)، ''اُردو جرنل'' (شعبہ اُردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ)، ''اُردو نامہ'' (شعبہ اُردو، ممبئی یونیورسٹی، ممبئی)، ''تنقید'' (شعبہ اُردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) کو چھوڑ کر دور دور تک سناٹا ہے۔ ہندستان کے مقابلے میں پاکستان کی ہر جامعہ میں قائم اُردو کے شعبہ جات میں لازمی طور پر سالانہ تحقیقی و تنقیدی مجلّہ شائع کیا جاتا ہے جن میں بیشتر اپنے مواد اور معیار کے اعتبار سے پاکستانی تحقیق و تنقید کا شناخت نامہ قرار پاتے ہیں۔ ''اکادمی''، ''بازیافت'' (شعبہ اُردو، پنجاب یونیورسٹی کالج، لاہور)، ''بنیاد'' (گورمانی مرکزِ زبان و ادب، لاہور یونیورسٹی آف منیجمنٹ سائنسز، لاہور)، ''خیابان'' (شعبہ اردو، پشاور یونیورسٹی، پشاور)، ''دریافت'' (شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لنگویجز، اسلام آباد) جیسے مجلّات فی زمانہ اعلیٰ علمی اور ادبی حلقوں میں نہایت احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ ہندستانی جامعات کے جن شعبہ جات میں جہاں کوئی مجلّہ شائع نہیں ہوتا ہے وہاں کے اساتذہ یقیناً باصلاحیت ہیں لیکن اس سمت میں وہ زیادہ مستعد نظر نہیں آتے۔ گزشتہ چار پانچ سالوں سے حکومتِ ہند کے بااختیار ادارہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، نئی دہلی نے جامعات میں برسرِ روزگار اساتذہ کی ترقی آئی۔ ایس۔ ایس۔ این۔ یافتہ مجلّات میں اُن کے مقالات کی اشاعت سے مشروط کر رکھا ہے جس سے بہت سارے اساتذہ متحرک سے ہو گئے لیکن منصبی ترقیوں کے بعد اُن کے قلم و قرطاس پہ زنگ لگ جاتی ہے اور مجلّہ جات میں اُن کی شمولیت برائے نام ہی رہتی ہے۔ بعض جامعات میں مجلّات کی

عدمِ اشاعت مالی دشواریوں سے جوڑ کر دیکھا جا رہا ہے اور یہ معاملہ صوبائی حکومتوں کے تحت کام کر رہی جامعات میں زیادہ نظر آ رہا ہے کیوں کہ اس قسم کی جامعات اکثر و بیشتر مالی پریشانیوں کے حصار میں ہوتی ہیں۔ مرکزی حکومت کے زیرِ انتظام جامعات میں مالیات کی فراوانی سے ایسے اہم علمی اور ادبی کام ہو جانے چاہئے تھے لیکن اُن میں برسرِ کار بعض اساتذہ جب باہمی نظریاتی اور دوسرے اختلافات میں سال بھر گھرے رہتے ہیں تو وہ مجلّہ کی اشاعت کی جانب توجہ مرکوز کریں تو کیسے؟ بعض شعبہ جات میں نظریاتی اختلافات باہمی رقابتوں کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں اور اساتذہ آپس میں دست و گریباں دیکھے گئے ہیں۔ یہ ساری صورتِ حال اساتذہ کی منفی تصویر پیش تو کر ہی دیتی ہے اور اس طرح بدنامی کا طوق بھی وہ پہن لیتے ہیں لیکن سب سے زیادہ نقصان اُردو زبان کا ہی ہوتا ہے۔ وہ اس لیے کہ اساتذہ کا یہ طبقہ اُردو کے نام پر غیر معمولی طور پر موٹی تنخواہیں وصول کرتے ہیں اور نتیجے کے طور پر اُردو دوستی کے بجائے بالواسطہ طور پر اُردو دشمنی کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔

اُردو زبان ہماری تہذیبی اور ثقافتی روایات اور اقدار کی امانت دار ہے۔ تہذیب و ثقافت کی مختلف توضیحات و توجیہات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر کسی ادیب، مورخ، دانشور اور فلسفی نے اِن میں اجتماعی خمیر کے نہاں اور عیاں ہونے پر اتفاق کیا ہے۔ لیکن اس اجتماعیت میں بہر صورت سماج کے ہر شخص کے انفرادی تفاعل کے اینٹ گارے کی بُو باس شامل ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے اُردو زبان ہماری اجتماعی تہذیب و ثقافت کا شناخت نامہ ضرور ہے لیکن اس کی تعمیر و تشکیل میں مختلف ادوار میں مختلف اشخاص نے جو انفرادی خدمات انجام دیں ہیں اُن سے کوئی بھی شخص صرفِ نظر نہیں کر سکتا بلکہ انہی انفرادی کاوشوں اور کوششوں سے یہ زبان آج مانندِ گلستان اپنی شادابی اور نکہت سے سارے برِ صغیر کو معطر اور محظوظ کر رہی ہے۔ غرض ہماری انفرادی سعی ہی اس اجتماعی میراث کو ہماری آنے والی نسلوں تک منتقل کر سکتی ہے۔ اس اہم میراث کے تئیں ہماری غفلت ہمیں ایک قومی سانحہ سے دو چار کر سکتی ہے۔ اس نوعیت کے اجتماعی سانحات کا فہم و ادراک سماج کا ہر شخص نہیں کر سکتا بلکہ ذی شعور اور حساس افراد ہی اس اجتماعی وراثت کے بارے میں فکر مند ہوتے ہیں۔ فی زمانہ ہندستان کے وہ لوگ اپنے بچوں کو اُردو زبان کی تعلیم سے دانستہ طور پر محروم کرنے کے مرتکب ہو رہے ہیں جن کی مادری زبان اُردو ہے۔ اگر چہ اعلیٰ تعلیمی سطح پر اُردو کے فارغ التحصیل طلبہ کو روزگار کے مسائل سے دو چار ہونا پڑتا ہے لیکن ابتدائی، تحتانوی، وسطانوی، ثانوی اور اعلیٰ ثانوی درجات میں دوسری زبانوں

کے ساتھ ساتھ بچوں کو احسن طریقے سے اُردو پڑھائی جاسکتی ہے۔اس ضمن میں مرکزی تعلیمی کمیٹی کے سفارش کردہ سہ لسانی فارمولے کا بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔لیکن مسئلہ وہی ہے کہ جب خود والدین ہی بچوں کو اُردو تعلیم دلانے پر رضامند نہیں ہیں تو آئینِ ہند میں شامل دفعات ۲۸ اور ۲۹ پر مشتمل بنیادی حقوق ہوں یا سہ لسانی فارمولہ؛ یہ سب اس معاملے میں کچھ بھی نہیں کرسکتے۔سماج کے باشعور اور حساس افراد کو آگے آکر اُردو زبان کے تحفظ اور ترقی کے لیے کوئی بھی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرنا چاہئے،بصورتِ دیگر اُردو اُن ساڑھے تین ہزار زبانوں میں شامل ہوجائے گی جن کے متعلق ماہرینِ لسانیات نے ۲۰۵۰ء تک معدوم ہونے کا اندیشہ ظاہر کیا ہے۔آیئے ہوش کے ناخن لے کر سرکاری اداروں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھے بغیر آج سے ہی انفرادی سطح پر اس خوبصورت زبان کے تحفظ کا سامان کریں۔

زیرِ ترتیب شمارہ آپ کے ہاتھوں میں دیر سے آرہا ہے۔ع

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
وہ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

کشمیر گزشتہ چار مہینوں (جولائی تا نومبر ۲۰۱۶ء) سے جس درد و کرب اور اضطراب و اضمحلال سے گزر رہا ہے اِن حالات میں جب عام انسان زندہ رہنے کے آداب تک بھول بیٹھے،اور گردشِ شام وسحر انسان کو بس سانس لینے کی رسم ادا کرنے کی اجازت دے،تو قلم کار جسے حساس اور ذی شعور ہونے کا لیبل لگا ہے،کس طرح قلم و قرطاس کی بزم آرائی کرے۔

ہم مقالہ نگاروں کے سپاس گزار ہیں کہ انہوں نے دستِ تعاون بڑھاتے ہوئے ''ترسیل'' کی اشاعت کا سفر جاری رکھنے میں ادارہ کی مدد کی۔ادارہ ''ترسیل'' فرداً فرداً سب خواتین وحضرات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے توقع کرتا ہے کہ مستقبل میں بھی آپ کی قلمی معاونت جاری رہے گی۔زیرِ نظر شمارہ کے مشمولات کے تعلق سے ادارہ کو آپ کے تبصرہ،تجزیہ،تنقید،رائے اور زرّیں مشورہ کا انتظار رہے گا۔

ڈاکٹر الطاف انجم

بتاریخ:۸/نومبر ۲۰۱۶ء مدیر ترسیل